ISSN Online : 2709-4030
ISSN Print : 2709-4022
Vol.8 No.3 2024

انشاءاللہ خان انشا پر تنقید کا اجمالی جائزہ

ڈاکٹر عثمانیہ سلطانہ

Abstract:

This article provides a critical overview of Insha Allah Khan Insha's poetry, highlighting his remarkable mastery over language and his contributions to various poetic forms such as ghazals, qasidas, masnavi, rubaiyat, and others. Insha's wit, humor, and command over language set his poetry apart, making it widely appreciated for its joyful and light-hearted tone. His works also reflect influences from renowned poets like Mir and Sauda. The article discusses his unique ability to write multiple ghazals in a single meter and his exploration of philosophical and mystical themes. It also notes his influence on literary circles, particularly in Delhi and Lucknow, where he triumphed in poetic contests. Despite occasional disagreements with friends like Rangin and Qateel, Insha's intellectual prowess and linguistic expertise remained unchallenged.

انشااللہ خاں انشا بڑے قادر الکلام شاعر تھے۔ ان کے کلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کو پڑھ کر خوشی حاصل ہوتی ہے۔ انھوں نے غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی، مسدس، اور مخمس وغیرہ میں جو طبع آزمائی کی اور انھیں اعلیٰ درجے تک پہنچایا۔ ان کی ذہانت اور بذلہ سنجی نے ان کے کلام میں جو خوبیاں پیدا کیں، اس سے نہ صرف ان کی شاعرانہ عظمت کا پتہ چلتا ہے بل کہ ان کی شاعری کی شہرت دور دور تک ہو گئی۔ باتوں باتوں میں وہ مذاق کا ایسا پہلو تلاش کر لیتے کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے۔ انشا کے لیے یہ سب کرنا کوئی مشکل نہ تھا کیوں کہ انشا کو زبان پر مکمل عبور حاصل تھا۔ انشا کے کلام میں مشہور و معروف شعرا کے کلام کا رنگ بھی نظر آتا ہے۔ انھوں نے متعدد شعرا کے طرز میں اشعار کہے ہیں مثلاً میر و سودا، میر سجاد اور کہیں کہیں معاملہ بندی میں جرأت کے رنگ میں بھی اشعار لکھے ہیں۔

انشا کا ایک خاص کمال یہ بھی تھا کہ وہ ایک ہی زمیں میں کئی کئی غزلیں کہتے تھے جنھیں اصطلاح میں دو غزلے، سہ غزلے، چہار غزلے، پنج غزلے وغیرہ کہا جاتا ہے۔ زبان پر قدرت ہونے کی وجہ سے محاورات کا صحیح استعمال بھی کرتے تھے۔ انشا کے کلام میں تصوف اور فلسفے کے مسائل کی جھلکیاں بھی پائی جاتی ہیں۔ انھوں نے نہایت خوب صورتی سے ان کو اپنے اشعار میں پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر یہ دو شعر ملاحظہ فرمائیں:

آتی ہے نظر اس کی تجلی ہمیں زاہد
ہر چیز میں ہر سنگ میں ہر خار میں ہر خس میں
کیوں شہر چھوڑ عابد غار جبل میں بیٹھا
تو ڈھونڈتا ہے جس کو ہے وہ بغل میں بیٹھا

دراصل انشا اپنی خوش قسمتی اور خوش طبعی جہاں یاسیت سے جگہ نہ پا سکی وہاں ان کے کلام میں بھی ناامیدی کا دور دور تک پتا نہیں ملتا۔ ظرافت اور خوش طبعی کی وجہ سے انھوں نے خوب نام پیدا کیا۔ انشا نے کسی استاد سے اصلاح نہیں لی البتہ اول اول اپنے والد میر ماشاءاللہ مصدر سے اصلاح لیتے تھے۔ ان کی کتب کی طرف دلی رغبت اور مطالعے کی عادت نے ان کی شاعری کو چار چاند لگا دیے۔ ان کی زندگی کا طوفانی دور دلی میں گزرا اور عروج کا زمانہ لکھنؤ میں سر ہوا جہاں شعر و سخن کی محفلیں سجتی رہیں اور انشا مشاعرے لوٹتے رہے۔ دلی میں عظیم بیگ سے معرکہ ہوا لیکن ہمیشہ فتح انشا کی ہوئی۔ مصحفی اور دوسرے لوگوں سے معرکہ آرائی ہوتی تو بھی جیت ہمیشہ انشا کا مقدر بنتی۔ انشا ایک قادر الکلام شاعر اور ماہر لسانیات تھے۔ عربی، فارسی، ترکی، پشتو، کشمیری زبانوں کے علاوہ ہندوستان کی تمام متعدد بولیوں پر انھیں عبور حاصل تھا جس زبان میں چاہتے شعر کہہ سکتے تھ۔ علمی سطح پر جہاں کسی استاد سے غلطی سرزد ہوئی، انشا نے دور کر دی۔ ان کی یہی بات لوگوں کو ناگوار گزرتی۔ ان کے جگری دوست رنگیں اور قتیل سے بھی اس معاملے میں بحث و مباحثہ جاری رہتا۔ اختلافات بھی ہوتے لیکن وہ اختلافات جز وقتی اور علمی نوعیت کے ہوتے، اس لیے جلد ختم ہو جاتے۔

اردو شاعری کا زیادہ تر سرمایہ غزل ہے اور یہ صنف شروع ہی سے شاعروں کا میدان رہی۔ انشا نے بھی اپنے پیش رووں کی طرح شاعری کی ابتدا غزل سے کی اور اس میں اپنے جذبات کا اظہار دل کھول کر کیا۔ غزل ایک طرح سے شاعر کی زندگی کا آئینہ ہوتی ہے۔ انشا غزل کے فن میں بڑے ماہر نظر آتے ہیں۔ انشا کی زندگی ایسے دور میں گزری جب ملک کے سیاسی، سماجی اور معاشرتی حالات بہت خراب تھے لیکن انشا اس معاملے میں بڑے خوش قسمت تھے جس دربار سے وابستہ ہوئے ان کے علم و فضل کی بدولت ان کی قدر و منزلت ہوئی اور وہ اعلیٰ مرتبے پر فائز ہوتے رہے۔ ان کا کلام ایسا دل موہ لینے والا ہے کہ اس کو پڑھ کر بڑی مسرت ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر انشا کے یہ اشعار پیش خدمت ہیں:

اچھا جو خفا ہم سے ہو تم، اے صنم اچھا
لو ہم بھی نہ بولیں گے، خدا کی قسم! اچھا
مشغول کیا چاہیے اس دل کو کسی طور
لے لیویں گے ڈھونڈ اور کوئی یار ہم اچھا
نزاکت اس گل رعنا کی دیکھیو انشا
نسیم صبح جو چھو جائے رنگ ہو میلا

انشاالله خان انشا نے غزل کے علاوہ رباعیات، قطعات، نظم، مخمس، مسدّس اور قصیدے وغیرہ جیسی اہم اصناف میں بہت کچھ لکھا ہے، لیکن غزل کے علاوہ قصیدے بھی خوب لکھے ہیں۔ انشا بے انتہا ذہین اور عالم فاضل شخص تھے۔ وہ کثیر اللسان مشہور تھے۔ اردو ادب کا شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس کو اتنی زبانوں اور بولیوں پر عبور ہو۔ انشا نے متعدد زبانوں میں اشعار کہہ کر اپنا سکہ منوالیا۔ انشا نے اس زمانے میں انگریزی میں بھی شعر لکھے ہیں۔ ہر صنف میں انشا نے اپنے کمالات کا مظاہرہ خوب کیا ہے لیکن ان کی شوخیٔ ظرافت اور بانکپن کے انداز نے ان کے قصیدوں میں تازگی اور ایسی شگفتگی پیدا کر دی ہے۔ انھوں نے شاہ عالم، شہزادہ سلیمان شکوہ اور نواب سعادت علی خاں کی مدح میں جو قصیدے کہے ہیں وہ ایک سے بڑھ کر ایک ہیں اور ان سب میں الفاظ کی شان و شکوہ موجود ہے۔

انشاالله خان انشا غزل کے ارتقا کی تاریخ میں ایسے مقام پر کھڑے نظر آتے ہیں جو دو دبستانوں کا سنگم ہے۔ ان کے یہاں ایک طرف دہلی کی سادگی اور متانت ملتی ہے اور دوسری طرف دبستانِ لکھنؤ کی رنگینی اور نشاط پرستی کا غلبہ ہے۔ انشا کا سب سے بڑا عطیہ یہ ہے کہ اس نے اردو غزل کے ایرانی مزاج کو ہندی مزاج سے ہم آہنگ کیا اور غزل کو نئے امکانات سے آشنا کرایا۔

آزاد صاحب کے اس جملے کو "آب حیات" میں رقم کرنے سے یہ جملہ تاریخ ادب اردو سے لے کر اردو ادب کی ہر کتاب، ہر مضمون میں یہی جملہ پڑھنے کو ملتا ہے۔ انتہائی افسوس کی بات یہ ہے کہ کسی نے خود سے تحقیق کرنے کی کوشش بھی نہیں کی کہ اس جملے میں کتنی صداقت ہے؟

کیا واقعی انشا کے فضل و کمال کو ان کی شاعری نے کھویا؟

اور کیا واقعی انشا کی شاعری کو سعادت علی خان کی مصاحبت نے ڈبویا؟

ہمارے تحقیق کار یہ جملہ "آب حیات" سے نقل کر کے اپنی کتابوں اور اپنے مضامین کی زینت بناتے رہے ہیں۔ کیا واقعی انشا کی شاعری بے کار ہے؟ اور کیا انشا کے فضل و کمال کو شاعری نے کھویا ہے؟ اور کیا شاعری کو سعادت علی خاں کی مصاحبت نے ڈبویا ہے؟

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی لکھتے ہیں:

> "دہلی چھوڑ کر لکھنؤ آنے والے شعراء میں طباعی، اذہانت، شوخی، طبعی، حاضر جوابی، بدیہہ گوئی اور ظرافت کے اعتبار سے انشاء الله خان انشا کا جواب نہیں لکھنؤ کی فضا نے انشا کے بگڑے ہوئے مذاق کو ایسا نوازا کہ ان کے جواہر اصلی تمسخر، پھکڑ اور شہدپن کے غبار میں چھپ گئے۔ محمد حسین آزاد بیتاب کے حوالے سے لکھتے ہیں "سید انشاء کے فضل و کرم کو شاعری نے کھویا اور شاعری کو سعادت علی خاں کی صحبت نے ڈبویا" دوسرے حصہ سے ڈاکٹر عبدالحق بھی اتفاق کرتے ہیں اور خود ان کی شاعری میں اردو، ہندی، پنجابی، فارسی، عربی اور ترکی زبان سے ان کی واقفیت، ان کی ذہانت اور طباعی کا اندازہ کریں تو بے

> ساختہ یہی خیال ہوتا ہے کہ اگر انہوں نے شاعری شروع نہ کی ہوتی تو غالباً جس ذہانت اور بصیرت کے ساتھ انہوں نے دریائے لطافت تصنیف کی اسی کی بدولت وہ خدمت زبان کے کتنے اور کیسے کیسے گراں بہا نمونے چھوڑ جاتے۔ انہوں نے شاعری اس زمانے میں اختیار کی جب شاعری کے زوال اور انحطاط کا دور شروع ہو چکا تھا، بہت ممکن تھا کہ انشاء اس کے نجات دہندہ ثابت ہوتے۔"(1)

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی صاحب کا یہ جملہ کافی غور طلب ہے ملاحظہ فرمائیں کہ "اگر انھوں نے شاعری شروع نہ کی ہوتی تو غالباً جس ذہانت اور بصیرت کے ساتھ انھوں نے دریائے لطافت تصنیف کی۔ اسی کی بدولت وہ خدمت زبان کے کتنے اور کیسے کیسے گراں بہا نمونے چھوڑ جاتے۔" تھوڑی دیر کے لئے ہم تسلیم کریں کہ انشا اللہ شاعر نہیں ۔ انھوں نے صرف "دریائے لطافت" ، "رانی کیتکی کی کہانی "، "سلک گوہر "، "ترکی روزنامچہ" اور "لطائف السعادت" جیسی تخلیقات پیش کی ہوتیں تو کیا اس وقت یہ محققین اور تنقید نگار خوش ہوتے؟ کیا اس وقت یہ انشاء کو بخشتے؟ کیا اس وقت یہ کہتے کہ ہاں انشا نے ادب کی صحیح معنوں میں خدمت کی؟ ان سوالات کا جواب "نہیں " ہے۔ یہی کہا جاتا کہ انھوں نے نثر میں جو یہ تجربہ کیا ہے تو اپنے ہم عصروں کو نیچا دکھانے اور اپنی بڑائی ثابت کرنے اور اپنی قادر الکلامی دکھانے اور اپنی رستمی حیثیت منوانے کے لئے اور دربار میں اپنے قد کو اونچا دکھانے اور نواب کے سامنے اپنی حیثیت منوانے کے لیے یہ سب کیا ہے۔ ثبوت حاضر ہے۔

انتظار حسین، انشا کی تخلیقات کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

> "تعلیم انھوں نے روایتی پائی تھی۔ اس زمانے میں جن علوم کا چرچا تھا، وہ سب سیکھے۔ منطق پڑھی، فلسفہ پڑھا، عربی سیکھی، فارسی سیکھی۔ ان زبانوں کے علاوہ بھی مختلف زبانیں سیکھ ڈالیں، ترکی، ہندی، پوربی، پشتو، پنجابی، کشمیری، بنگلہ، یہ مختلف زبانیں انہوں نے اس شان سے سیکھیں اور علوم پر اتنی قدرت حاصل کی کہ وہ آسانی سے ایک عالم کا روپ دھار سکتے تھے، مگر علمی روایت تو خود ایک حصار ہے۔ یہ روایت آدمی سے خالص ذہنی زندگی گزارنے کا اور تجربوں سے بے تعلق ہو جانے کا تقاضا کرتی ہے۔ جس آدمی نے اپنی شخصیت کے سارے دریچے تازہ ہوا کو آنے دینے کے لیے وا کر رکھے ہوں، وہ آدمی مجرّدات کی دنیا میں مقیّد ہو کر کیسے بیٹھ جاتا۔ سید انشا صاحب عالم و فاضل ضرور تھے مگر وہ تجربوں کا دروازہ اپنے اوپر بند نہیں کر سکتے تھے۔ میاں بے تاب نے یہ نکتہ نہ سمجھا اور حکم لگا دیا کہ سید انشاء کے فضل و کمال کو شاعری نے کھویا اور شاعری کو سعادت علی خاں کی مصاحبت نے ڈبویا۔ عالم اپنے فضل و کمال سے نہیں اپنے علمی رویّے سے پہچانا جاتا ہے۔ سید انشاء کا رویہ ہی علمی نہیں تھا۔ وہ مجرّدات میں نہیں سوچ سکتے تھے، Images میں سوچتے تھے۔ دریائے لطافت ان کا علمی کارنامہ ہے مگر یہ دیکھیے کہ کیا ماہرین لسانیات اور علما قواعدِ زبان کے مسائل کے بارے میں اس رنگ میں سوچا کرتے ہیں؟ طبقوں اور شہروں کے لہجوں میں فرق کرتے کرتے وہ معاشرتی تصویریں بنانے لگتے ہیں اور کردار تخلیق کرنے لگتے ہیں۔ ایسا رویّہ رکھنے والا شخص اپنے منفرد انداز میں اِکادُکا علمی کارنامے تو انجام دے سکتا ہے مگر روایتی قسم کا عالم نہیں بن سکتا۔ اس رویّے کے ساتھ تو آدمی شاعر اور افسانہ نگار ہی بن سکتا ہے......آخر انشاء کو دربار میں بھی تو اپنی قابلیت کے جھنڈے گاڑنے تھے اور حریف ہم عصروں کو بھی پچھاڑنا تھا۔ اس وقت کی مخصوص ادبی فضا میں یہ کام محض اپنے شعری تجربے سے معاملہ رکھ کر انجام نہیں دیا جا سکتا تھا۔ اس کے لیے تو دوسرے ہی حربے استعمال کرنے تھے، یا شاید انشاء کو یوں بھی اپنی ذہانت کے کرشمے دکھانے کا بہت چسکا تھا۔ ذہانت کے کرشمے انہوں یوں بھی دکھائے کہ اُردو میں شعر کہتے کہتے عربی میں نکل گئے یا ترکی میں طبع آزمائی کرنے لگے۔ آدمی ہفت زبان تھے، اس لیے ایسی طبع آزمائی ان کے لیے کیا مشکل تھی۔"(2)

یہ آپ سب نے ملاحظہ کیا کہ کیسے ایک شخص کی تخلیقات کو غلط رنگ دینے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ایک صاحب فرما رہے ہیں کہ وہ شاعری نہ کرتے تو وہ معلوم نہیں دریائے لطافت جیسی کتنی اور کیسی کیسی گراں قدر خدمات انجام دیتے تو دوسرے صاحب ان کی نثری خدمات کو ایک اور رنگ دینے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں اور دوسروں کے ذہنوں میں یہ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اس شخص نے یعنی انشا نے یہ سب تخلیقات اس لیے نہیں کیں کہ ان کے پاس کہنے کو بہت کچھ تھا یا اس نے بے نقط

کہانی اس لیے نہیں لکھی کہ ان کے پاس علم تھا یا قابلیت تھی بلکہ یہ سب وہ اپنے ہم عصروں کو نیچا دکھانے کے لئے لکھ رہے تھے۔ کیونکہ انشا کے یہاں درباری زندگی کے طفیل گونا گوں ادبی چسکے پیدا ہوئے تھے، اور ان میں ایک چسکا غیر منقوطہ زبان لکھنے کا تھا۔ حیرت کی بات تو یہ ہے کہ جمیل جالبی صاحب بھی ایسا ہی سوچتے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی لکھتے ہیں:

> ”یہی صورت ان کے مختصر دیوانِ غیر منقوطہ کی ہے۔ اس میں انشاء نے ایسے الفاظ استعمال کیے ہیں جو بے نقطہ ہوں۔ جب یہ پابندی شاعر خود پر لگالے تو کیسے ممکن ہے کہ وہ محدود لفظوں کی مدد سے ایسے شعر کہے جس میں جذبے، احساس یا فکر کا اظہار ہو سکے۔ انشاء کا کلام ویسے بھی جذبہ واحساس سے عاری ہے اور یہ چیز غیر منقوطہ کلام میں انتہا کو پہنچ گئی ہے۔ انشاء نے اس صنعت کو غزل، مثنوی، رباعی، مخمس میں استعمال کر کے اپنی قادر الکلامی کا اظہار تو یقیناً کر دیا ہے لیکن آج یہ مشکل عمل میکانیکی معلوم ہوتا ہے۔ اس میں وہ مزہ بھی نہیں ہے جو انشا کی غزلوں میں ملتا ہے۔ یہ ایک بے مزہ اور بے ذائقہ ہے اور ان تماشوں میں سے ایک تماشا ہے جو انشا کی جدت پسند طبیعت زندگی بھر دکھاتی رہی۔
>
> دیوان سینکڑوں ہی دیکھے ہیں ہم نے لیکن
> ان میں نظر پڑا کب، باباجو یاں تماشا
> کیا خوب واہ ماشاءاللہ، ہے عجب کچھ
> دیوان میرا، انشاءاللہ خاں تماشا(3)

دراصل مغرب میں ایک زمانے میں یہ بحث چلی تھی کہ کیا ”ادب“ ہونا چاہیے کہ نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن ہندوستان اتنا خود کفیل تھا علم کے معاملے میں یہاں یہ بحث ہوئی ہی نہیں، کیونکہ یہ بحث وہاں ہو گی جہاں جہالت ہو گی۔ ہندوستان میں یہ بحث کیوں ہو گی؟ اس بحث کی یہاں ضرورت ہی نہیں۔ یہاں کے لوگ اس بحث سے بالکل ناآشنا ہیں۔ کیوں کہ یہاں جگ جگہ مکتب، مسجد، مندر، وہار اور دوسری عبادت گاہیں تھیں جہاں پر بچوں کو مفت تعلیم دی جاتی تھی۔ اس لیے علم امیر غریب سب کے بچوں کے لیے برابر تھی۔ مسلمان گھرانوں میں چھ سال کی عمر میں بچہ قرآن کی تعلیم سیکھنا شروع کرتا پھر آہستہ آہستہ عربی، فارسی یا جو بھی اس عہد کے مروجہ اصول تھے علم کے حوالے سے انھیں سیکھتا اور اپنے آپ کو بہتر بناتا۔ جن کے والدین خود کسی علم میں عالم فاضل ہوتے تھے وہ اپنے بچوں کے ساتھ زیادہ محنت کرتے تھے اور ان کے بچے دوسروں سے زیادہ علم حاصل کرتے تھے جس کی مثال انشا کی صورت میں ہمارے سامنے ہے کیونکہ انشا کے والد خود بھی شاعر تھے اور مصدرؔ تخلص کرتے تھے۔ اسی طرح میرؔ کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ وہ دہلی کی جامعہ مسجد کی سیڑھیوں کو بھی درس گاہ کا درجہ دیتے ہیں۔ اسی طرح شبلی نعمانی کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ ان کے اور ان کے استاد محترم فارغ اوقات نہیں ملتے تھے۔ تو وہ راستے میں اپنے استاد کے ساتھ چلتے جاتے تھے اور ان سے علمی حوالے سے تبادلہ خیال کرتے تھے۔ اس زمانے میں برصغیر میں ہر گھر، گلی، محلے میں مشاعرے ہوا کرتے تھے اور سب کے پاس اپنی ڈائری، بیاض وغیرہ ہوتے تھے۔ اس زمانے میں شعر وشاعری کا اتنا رواج تھا کہ حجام، ترکھان، لوہار اور دوسرے پیشے کے افراد بھی شعر وشاعری کرتے تھے اور اپنے اپنے حلقے میں مشاعرے منعقد کرتے تھے یا دوسروں کے مشاعروں میں شرکت کرتے تھے۔ اس زمانے میں شاعری میں استادی اور شاگردی کا بھی بڑا رواج تھا۔ شاعروں کی بڑی عزت، بڑا رتبہ تھا اس زمانے میں صرف عام لوگ ہی شعر وشاعری سے شغف نہیں رکھتے تھے بلکہ بادشاہ اور ان کے درباری اور نواب امیر امرا سب شعر وشاعری کرتے تھے اور شاعروں کو باقاعدہ دربار میں بلاتے تھے اور ان کو نوکریاں دی جاتی تھیں اور ان کی تنخواہ مقرر کی جاتی تھی۔ اس زمانے میں دربار میں کم از کم ایک شاعر کا ہونا لازمی تھا یہ جو حضرات کہتے ہیں بغیر سوچے سمجھے کہ انشا کی شاعری کو سعادت خان کی مصاحبت نے ڈبویا، سراسر غلط ہے۔ انشا عالم فاضل اور امیر باپ کے بیٹے تھے، اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کہیں ملازمت نہ کرتے۔ کتنا ہی امیر شخص کیوں نہ ہو اگر اصل زر کھانا شروع کر دے تو ایک دن وہ بھی ختم ہو جاتی ہے۔ اس لیے انشا کو بھی ہم دیکھتے ہیں تو وہ کہیں نہ کہیں ملازمت کر رہے ہوتے۔ کبھی دہلی میں، کبھی فیض آباد میں تو کبھی لکھنؤ میں، انشا کی زندگی ایک کھلی کتاب کی طرح ہمارے سامنے عیاں ہے۔ ہم انشا کو ان کی شاعری میں دیکھتے ہیں پھر انہیں ”دریائے لطافت“ میں اور ان کی داستان میں دیکھتے ہیں اور ان کی دربار سے باہر زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں ہمیں ایک ہی انسان نظر آتا ہے ہنستا مسکراتا، نہایت خوش مزاج، مسکراہٹیں بکھیرتا، اپنے ہم عصروں سے بھی یہی خوش مذاقی اور اپنے سے بڑے بڑوں کے ساتھ بھی دوستی، کیونکہ انشا میر حسن کے والد میر غلام حسین ضاحک کے دوست تھے۔ انیس سالہ انشا اور بوڑھے میر ضاحک کی اسی دوستی کی وجہ خوش مزاجی اور ہم مذاقی کی وہ قدر تھی جو انشا اور میر ضاحک میں مشترک تھی۔ انشا کو زبان و بیان، علم عروض اور بیان وبدیع پر مکمل عبور تھا۔ انشا کے سامنے اگر کوئی علمی حوالے سے کوئی غلطی کرے تو انشا اس وقت ان کی اصلاح کر دیتے تھے جیسے دہلی میں عظیم بیگ اور

انشا کے معرکے کے حوالے سے اردو ادب کی تاریخیں اور دوسرے چھوٹے بڑے مضامین بھرے پڑے ہیں۔ یہاں ایک اور سوال ذہن میں ابھر رہا ہے۔ کونسا ایسا شخص ہو گا یا ایسا استاد ہو گا جس کے سامنے کوئی غلط بولے اور وہ اس کی اصلاح نہ کر دے۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ لیکن اگر انشا نے کسی کی اصلاح بھی کی ہے تو اس بات کو بھی غلط انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ بجائے اس کا شکریہ ادا کرنے کے۔ اسی بدولت ہی عظیم بیگ اور قدرت اللہ قاسم اور دو چار اور شاعر انشا کے دشمن بن گئے تھے۔ ان کو پتہ تھا کہ ہم علمی حوالے سے انشاء کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ لہٰذا انشا پہ تنقید کر کے اور ان کے ضخیم دیوان میں سے چند ایسے شعر نکالے جن کو اگر پوری غزل کے ساتھ پڑھیں تو مطلب پوری طرح سمجھ آتی ہے کہ یہ اشعار کس لمحہ کس وقت اور کس موڈ میں انشا نے کہے تھے لیکن اگر انہیں الگ الگ نکال کر ان کی مثالیں پیش کریں اور انہیں پہ تنقید کر کے ایک عالم فاضل اور علمِ لسان شخص کی اتنی غلط ترجمانی کی ہے کہ اردو ادب ایسے کند ذہن لوگوں کو کبھی معاف نہیں کرے گی۔ لکھنؤ میں بھی انشا کے ساتھ یہی معاملات در پیش تھے وہ لوگوں کی غلطیوں پر ان کی اصلاح کرتے تھے اور وہ اس بات کو اپنی ذات کے اوپر بہتان سمجھتے تھے وہ یہ نہیں کرتے تھے کہ اپنی علمی کمی کو دور کریں اپنی سوچ و بچار کو بڑھائیں، ریاض کریں، اپنی ذات کو بہتر کریں، نکھاریں، نہیں یہ سب نہیں کرتے تھے بلکہ وہ الٹا انشا کو مورد الزام ٹھہراتے تھے۔ انشا نے ہمیشہ دوسروں کے ساتھ اچھا سلوک کیا شہزادہ سلیمان کے دربار میں مصحفی کی رسائی انشا کی بدولت ہوئی اور مرزا قتیل کو ''دریائے لطافت'' میں دوسرا حصّہ لکھنے کی دعوت انشا نے دی۔ قتیل انشا کے دوست تھے۔ یقیناً انشا کو علم ہو گا کہ قتیل کو سامنے آنے میں وقت لگے گا۔ ہو سکتا ہے کہ انشا قتیل کی علمی خوبیوں سے بھی واقف ہوں مگر انشا نے اسے دریائے لطافت لکھنے کی دعوت دے کر انھیں کتنا بڑا مقام دیا کہ آج ہم انشا اور قتیل کا ذکر اکٹھے ہی کرتے ہیں۔ اتنا بڑا دل تو صرف ایک خوب صورت اور خوب سیرت اور انسان دوست کے پاس ہی ہو سکتا ہے کہ اپنی اس تخلیق میں جو رہتی دنیا تک ان کی پہچان بنے گی اور اس بات کا انشا کو بخوبی علم تھا کہ وہ کیا تخلیق کرنے والے ہیں اور اردو زبان میں اس کی کیا اہمیت ہو گی۔ انشا کی بدولت ہی مصحفی اور جرأت کی رسائی شہزادہ سلیمان کے دربار میں ہوئی۔ انشا کی بد قسمتی یہ ہے کہ انہیں داناد شمن اور نادان دوست ملے۔ ان کے نادان دوست ان کے حق میں وہ سب کچھ نہیں لکھ سکے جو ان کے داناد شمن لکھ گئے۔ یہی وجہ ہے کہ انشا جیسے عالم و فاضل شخص دو صدیاں گزرنے کے باوجود بھی اندھیروں میں ہے اور محمد حسین آزاد جیسے گپ شپ ہانکنے والے تنقید نگار نے انھیں جیسے پیش کرنا چاہا، کر لیا ۔

شبلی نعمانی نے بالکل صحیح کہا تھا کہ ''آزاد گپ بھی ہانک دیں تو وحی معلوم ہوتی ہے۔'' اور انہوں نے سو فیصد صحیح کیا ہے۔ اگر آزاد کی گپ شپ وحی نہ ہوتی تو انشا کا مقام آج کچھ اور ہوتا۔ آزاد کی وحی کی بدولت آج تک کسی نے انشا کو جاننے اور ان کی شاعری کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی۔ کیونکہ ان کے سامنے انشا کی عمر بھر کی تخلیقات کی کوئی وقعت نہیں بلکہ آزاد کی وحی اہم ہے۔ آزاد نے ''آب حیات'' میں صرف انشا کی شخصیت کو ہی مجروح نہیں کیا بلکہ ایک اور بڑا ظلم یہ کیا کہ ان کے شاہکار بے نقط دیوان کے بارے میں کہا ''دیوان بے نقط'' ایک معمولی طبع آزمائی ہے اس میں کوئی بات قابل تحریر نہیں۔'' آزاد صاحب نے انشا کو میلے ٹھیلے کا بندہ قرار دیا۔ حال آں کہ میلے ٹھیلے کے بندے آزاد صاحب ہیں۔ ایک لمحے کو سوچیں کہ جس طرح آزاد دوسروں پر بغیر سوچے اتنا بڑا فتویٰ لگاتے ہیں، ذرا سی دیر کو بھی نہیں سوچا کہ ان کے اپنا فتویٰ لگانے سے کسی شخص کو کتنا بڑا نقصان پہنچ سکتا ہے؟

محمد حسین آزاد کو چاہیے تھا کہ صرف گپ شپ لگانے کے بجائے انشا کے اوپر کچھ تحقیق کرتے۔ اگر نہ کر سکتے تھے تو انشا کی تاریخ پیدائش ہی معلوم کرتے کیونکہ انشا کو فوت ہوئے غالباً پندرہ سال گزر چکے تھے۔ اس وقت ان کے خاندان کے بزرگ یا جوان کوئی تو موجود ہوتے ۔ سعادت خان سے اگر آزاد چاہتے وہ سارے معلومات لے سکتے تھے کہ کیا واقعی اس نے انشا کی تنخواہ بند کر دی؟ اور کیا واقعی انشا جنوں کے مرض میں مبتلا ہو کے دنیا سے رخصت ہو گئے؟ نہیں آزاد صاحب اپنے پیٹ کا پانی کیوں ہلائیں؟ اللہ تعالیٰ نے انہیں دماغ، زبان اور قلم کی طاقت جو دی تھی جس سے وہ بیٹھے بٹھائے ایسی سحر انگیز گفتگو کرتے تھے کہ لوگ ان کی گفتگو کے سحر سے ہی نہیں نکلتے تھے۔ وہ دماغ سے خرافات سوچتے اور زبان سے چسکیاں بھرتے اور قلم کے تیر چلاتے تو ان کا کام ہو گیا ۔ اپنی انہی سحر انگیز باتوں کی بدولت وہ اردو ادب میں کسی نہ کسی حوالے سے زندہ ہیں۔ یہاں پر صرف آزاد صاحب پر کی گئی تنقید کے حوالے سے بحث ہو رہی ہے ورنہ نثری خدمات میں ان کا گراں قدر سرمایہ موجود ہے جس سے اردو ادب کے کسی بھی طالب علم کو اعتراض کی مجال نہیں ہے۔

انشا جب دہلی میں تھے تب وہ شاہ عالم سے بھی وابستہ تھے۔ انشا کی شاہ عالم کے ساتھ باقاعدہ وابستگی معلوم نہیں ۔ صرف ایک جشن میں انھوں نے ایک قصیدہ شاہ عالم کی نذر کیا تھا۔ جس کا ذکر جمیل جالبی صاحب نے ''تاریخ ادب اردو'' جلد سوم میں کیا ہے لیکن ان کا کہنا ہے کہ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ انشا نے قصیدہ لکھ کر بزم خاص میں شامل کرنے کی استدعا کی تھی لیکن کسی تذکرہ یا تاریخ سے یہ نہیں پتہ چلا کہ آیا وہ شاہ عالم ثانی سے وابستہ ہوئے تھے یا نہیں؟ صرف شاہ عالم کے دربار میں انشا کا آنا جانا تھا۔ اس حوالے سے بھی آزاد صاحب نے بہت کچھ لکھا ہے جس پر عابد پشاوری نے آب حیات کا تنقیدی اور تفصیلی جائزہ لیا ہے اور سیر حاصل گفتگو کی ہے:

ان دنوں شاید اور بھی تجھ کو مزا پڑا ہے کچھ
آتی ہے کیتکی کی باس تیرے گلاب باش سے(4)

اس کے علاوہ بھی متعدد الفاظ ان کی کلیات میں جابجا نظر آتے ہیں چند مثالیں اشعار کی پیش خدمت ہیں:

مہادیو اُترے اُترے جو کیلاش سے اپنی جٹا کھولے
تو شاید بن سکے اس جوگ کے بیراگ کا جوڑا(5)

کنور جی تیرے جو سونے ہیں ساتھ انشاء کے
تو جاگے سونے کے اور اُس کے بھاگ پانی پر(6)

جہاں کے تھے راجہ بھرتری جی، کنواں بنانے کو واں کس نے
زمیں کھودی تو ایک جوگی دھرے ہوئے سر پہ ناند نکلا(7)

انشا نے اپنے اشعار میں سنسکرت الفاظ کا استعمال بھی جابجا کیا ہے نمونے کے طور پر چند اشعار ملاحظہ کیجیے:

انشا بدل کے قافیے رکھ چھیڑ چھاڑ کے
چڑھ بیٹھ ایک اور بچھیڑے اکھنڈ پر(8)

یہ جو مہنت بیٹھے ہیں رادھا کے کنڈ پر
اوتار بن کے گرتے ہیں پریوں کے جھُنڈ پر(9)

لیٹ کر کرشن جی سے رادھکا یونہی لگی کہنے
ملا ہے چاند سے، اے لو اندھیرے پاکھ کا جوڑا(10)

کسی جوگی نے چھو منتر سکھایا ہے مجھے انشاء
لیے پھرتا ہوں میں چٹکی میں اپنی ماش کا جوڑا(11)

مہابھارت کے قصوں کے سوایاں اور تو کچھ بھی
نہیں ہم پاس صاحب کے گراف ولاف کا جوڑا(12)

انشا کی ایک غزل اس مقطعے پہ ختم ہوتی ہے:

کہہ کہانی کے سمے کی غزل اک انشاء اور
کہ بلاتیں تیری یہ پچھلا پہر لیتا ہے(13)

اس مقطع کے بعد جو غزل شروع ہوتی ہے جو داستانوں اور کہانوں کے معروف کنائیوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ اس غزل میں وہ سب کچھ ہے جو رانی کیتکی کی کہانی میں ہمیں نظر آتا ہے اس غزل سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ انشاء کے ذہن میں کوئی کہانی پنپ رہی تھی لیکن غزل میں انشا اس کا اظہار تو کر رہے ہیں لیکن انشا اس سے مطمئن نہیں تھے۔ انشا کو غزل کی نہیں کسی اور صنف کی ضرورت تھی کیونکہ غزل میں کچھ پابندیاں ہیں۔ انشا کا تخیل اسے کچھ اور کرنے پر مجبور کر رہا۔ اردو غزل فارسی صنف غزل کی پیداوار ہے، اس لیے اس میں بند شیں ہیں اور انشا کا تخیل عجمی اور ہندی دونوں تہذیبی ملاپ سے ہٹ کر کچھ اور، کچھ نیا کرنے کا متقاضی ہے۔ انشا نے ہندی تہذیب کا بہت ہی قریب سے مشاہدہ کیا ہے اس لیے اس کا تجربہ اس غزل میں نظر آتا ہے۔ اس غزل کو پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے کہ انشا نے وہ کہانی غزل کی صورت میں تیار کر لی ہے بس اسے نثر میں لکھنا باقی ہے۔

غزل پیش خدمت ہے:

اے پری تیرے مزے ایک بشر لیتا ہے

اور خرّاٹے پڑا دیو سحر لیتا ہے
تکیہ جو فضل خدا اسار پہ کر لیتا ہے
وہ سبک رو کوئی گڑ پنکھ کے پر لیتا ہے
اژدھا سے شب یلدا کو کرے ہے ٹکڑے
اور اُن ٹکڑوں کو دھر زیر سپر لیتا ہے
اُس کو خواہش نہیں ہوتی ہے الوپ رنجن کی
باندھ کر سوت رہ تار نظر لیتا ہے
منہ پہ جولی کے کھڑاویں وہ ٹپک مارے ہے
بس تو نکل پہ فقط باندھ کمر لیتا ہے
نہ کوئی دیکھے اُسے اور وہ سب کو دیکھے
ٹوپی اس روپ کی کب کوئی نڈر لیتا ہے
ضد سے ہر شاخ کے وہ بتھنے کی صورت نجار
ہاتھ میں ایک کوئی نو من کا تبر لیتا ہے
فکر کی چیز تو رکھتا ہی نہیں کچھ انشاء
خضر ہمت کو فقط سامنے دھر لیتا ہے(14)

انشا کے اشعار اور یہ غزل پڑھنے کے بعد آپ خود فیصلہ کر سکتے ہیں کہ بیتاب کی بات میں کتنی صداقت ہے؟ کیا انشا کے فضل و کمال کو ان کی شاعری نے ڈبویا ہے؟ یا انشا آج اپنی شاعری کی بدولت زندہ ہیں راقمہ کے خیال میں انشا اپنی شاعری کی بدولت ہی زندہ ہیں اگر وہ شاعر نہ ہوتے او اپنی غزلوں میں اور باقی اصناف میں وہ مختلف تجربات نہ کرتے تو وہ کبھی بھی ”دیائے لطافت“ جیسی کتاب تخلیق نہیں کر سکتے تھے اور شاعری ہی کی بدولت انھوں نے اردو زبان کو ایک الگ شناخت دینے کی کوشش کی۔ انھوں نے سب سے پہلے ایک مثنوی لکھی ”در لہجہ“ اس ادھوری مثنوی میں کوئی پچپن اشعار ہیں۔ اس میں انھوں نے خالص اردو لکھنے کی کوشش کی۔ اس کے بعد انھوں نے رانی کیتکی کی کہانی لکھی اس میں بھی وہی تجربہ کیا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی اس مثنوی در لہجہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ”اس مثنوی میں سوائے اس کے کوئی خاص بات نہیں ہے کہ (۵۱) اشعار میں ایک لفظ بھی عربی، فارسی، ترکی کا استعمال نہیں ہوا اور اسی لیے نظم میں انشا کا یہ تجربہ ناکام ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ انشا کو یہ کام کرتے ہوئے پتہ چلا کہ فارسی، عربی، ترکی کے الفاظ چونکہ اردو زبان کا جزو لاینفک بن چکے ہیں اس لیے انہیں نوچ کر نہیں پھینکا جا سکتا۔ یہ سب بول چال کی عام زبان کا وسیلۂ اظہار ہیں انشاء کی جدت پسند طبیعت اپنی ذہانت و ذکاوت کے اظہار کے لئے نئے راستے تلاش کرتی رہتی تھی جس کا اظہار انشا کو پڑھتے ہوئے قدم قدم پر ہوتا ہے۔ یہ ادھوری مثنوی بھی اسی مزاج کا کرشمہ ہے۔“(15)

آپ خود فیصلہ کریں کہ آپ کے پاس اس سے پہلے کوئی ایسی مثال موجود نہیں ہے اور آپ نے اپنا ذہن استعمال کیا، اس زمانے میں جہاں اکثریت صرف لکیر کے فقیر تھے اس زمانے میں ایک شخص تن و تنہا کچھ نیا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور جمیل جالبی صاحب خود بہت بڑے محقق ہیں، تخلیق کار ہیں وہی ایسا کہیں تو ہم دوسرے لوگوں کو تو کچھ نہیں کہہ سکتے۔ جمیل جالبی صاحب کہتے ہیں ”اس مثنوی میں سوائے اس کے کوئی خاص بات نہیں ہے کہ (۵۱) اشعار میں ایک لفظ بھی عربی، فارسی اور ترکی کا استعمال نہیں ہوا اور اسی لیے نظم میں انشا کا یہ تجربہ ناکام ہو گیا۔(16)

ایک زبان جو تین اور زبانوں سے مل کر بنی ہے اور اس زبان میں سے انشا تین زبانوں کو نکال کر صرف اپنی زبان کو ایک الگ شناخت دینے کے لیے تجربہ کر رہے ہیں اور اس زبان میں انشا (۵۱) اشعار لکھنے میں کامیاب بھی ہوئے۔ تو کیا یہ ایک معمولی بات ہے؟ راقمہ کے نزدیک یہ کوئی معمولی بات نہیں یہ تو شاعر حضرات بہتر جانتے ہیں کہ ایک سیدھا سادھا شعر لکھتے، سوچتے اور اس کو مکمل کرنے میں جتنی محنت لگتی ہے اتنی محنت نثر میں نہیں لگتی ہو گی۔ لیکن یہاں انشا نے کامیابی سے (۵۱) اشعار لکھ چکے ہیں۔

جمیل جالبی صاحب کا یہ کہنا بھی بجا نہیں ہے کہ "اسی لیے نظم میں انشا کا یہ تجربہ ناکام ہو گیا۔" راقمہ کے نزدیک تجربہ کوئی بھی ہو وہ ناکام نہیں ہوتا بلکہ اس تجربے سے آپ کا ذہن مزید کھلتا ہے۔ اس سے آپ کے ذہن میں ایک نئی کھڑکی کھلتی ہے اور تازہ ہوا کے جھونکے آنے شروع ہوتے ہیں اور آپ مزید کچھ نیا کچھ انوکھا کرتے ہو۔ یہی انشاء کے ساتھ ہوا۔ اس مثنوی کو لکھتے لکھتے انہوں نے سوچا ہو گا کہ اس طرح نثر میں کوئی کہانی لکھی جائے۔

راقمہ کے نزدیک انشا کا تجربہ نہایت کامیاب رہا ہے۔ اگر انشا مثنوی "در لہجہ" (۵۱) اشعار میں تحریر نہ کرتے اس کے بعد رانی کیتکی کی کہانی تحریر کرنے کا تجربہ نہ کیا ہوتا تو برملا یہ اعلان نہیں کر سکتے تھے کہ جو لفظ اردو میں آیا وہ اردو کا ہو گیا خواہ وہ کسی بھی زبان سے ہو۔ اصل کی رو سے غلط ہو یا صحیح اس اعلان اور اس پر اعتماد لہجے کے پیچھے وہ تجربات ہیں جو انہوں نے اپنی شاعری میں کیے تھے۔ اس لیے انشا کی شاعری کو بے کار کہنا اور بے کار جاننا سراسر نادانی ہے۔

سب سے پہلے ہم یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ تخلیقی تجربہ کیا ہے؟ استاد محترم ڈاکٹر محمد خان اشرف نے اس پر سیر حاصل بحث کی ہے مگر ہم اس کا مختصر بیان کریں گے۔ تخلیق سے مراد ہے عدم سے وجود میں لانا۔ خدا کے بعد تخلیق صرف انسان کر سکتا ہے اس لیے اس کا یہ تجربہ اسے تمام مخلوقات سے ممتاز کرتا ہے۔ وہ مصور، سنگ تراش، موسیقار یا کوئی معمار، گلوکار ہو یا کوئی موجد، یہ تمام اس تخلیقی عمل میں شامل ہیں جس سے ان کی تخلیقات اور ایجادات وجود میں آتی ہیں، ان میں جو فرق ہے وہ ان کے ذریعہ اظہار و ابلاغ سے آتا ہے۔ تخلیقی عمل کے وجودی حصہ میں یہ سب ایک ہیں۔

اس حوالے سے ڈاکٹر محمد خان اشرف لکھتے ہیں:

> "انسان کی یہ خصوصیت اس کو دوسری مخلوقات سے ممتاز کرتی ہے۔ یہ اس کا تخلیقی عمل ہے جس کے ذریعے وہ نئی چیزیں ایجاد کرنے، دریافت کرنے، تخلیق کرنے اور عدم سے وجود میں لانے کا عظیم کام انجام دیتا ہے۔ یہ تخلیقی عمل انسان کے وجود میں برپا ہوتا ہے لیکن اس کا اظہار دوسرے لوگ دیکھتے ہیں۔ یہ اظہار نئی ایجادوں کی شکل میں ہوتا ہے اور نئے فنون کی شکل میں بھی، شاعری ہو یا مصوری، موسیقی ہو یا مجسمہ سازی، نئے علوم کا انکشاف ہو یا نئی حقیقتوں کی دریافت، ان سب کی بنیاد یہی عمل ہے جو بیان کی آسانی کے لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان کے وجود میں برپا ہوتا ہے اور اسے ہم تخلیقی عمل کے نام سے پکارتے ہیں کیونکہ اس عمل کے نتیجے میں تخلیق وجود میں آتی ہے۔ تخلیق یعنی کسی چیز کا عدم سے وجود میں آنا اور یہ ترکیب انھی چیزوں پر صادق آتی ہے جو انسان اپنے اس عمل سے پیدا کرتا ہے۔ اس طرح یہ انسانی خصوصیت اس کی تمام تخلیقات کی بنیاد ہے۔" (17)

جمیل جالبی صاحب انشا کی شاعری اور ان کی تخلیقات کے لیے جو دل میں آئے، لکھتے چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح لکھتے لکھتے انشا کی دیوان کو دُکان قرار دیا اور ان کے پڑھنے والوں کو اور چاہنے والوں کو یا ان کے قاری کو گاہک قرار دیا۔ یقین نہیں آتا کہ جمیل جالبی صاحب نے یہ سب لکھا ہے۔ انھوں نے تو راقمہ کو بھی کش مکش میں ڈال دیا ہے۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنے دل اور دماغ کی سنوں یا ان محققین اور ناقدین نے جو کچھ لکھا ہے ان کی باتوں کو سچ تسلیم کروں۔ کافی غور و فکر کے بعد راقمہ نے سوچا کہ بہتر یہی ہے کہ اپنے دل اور دماغ کی سنوں اور جو کچھ انشا کے حوالے سے ان کی شاعری اور تخلیقات کے حوالے سے محسوس کر رہی ہوں اسے سامنے لے کر آؤں۔ قصّہ مختصر اس حوالے سے اقتباس ملاحظہ کیجیے۔

> "انشا نے اپنی دوکان شاعری میں ہر میل کا مال جمع کیا جس کی مانگ تھی تاکہ ہر قسم کا گاہک ان کی دوکان پر آئے اور اپنی پسند کی چیز حاصل کر سکے۔ انشاء شعوری طور پر یہ کام کرتے ہیں اور اپنی دوکان چمکانے کے لئے اپنی غزل میں اشتہار بھی دیتے ہیں:

میر و قتیل، مصحفی و جرأت و مکیں

> ہیں شاعروں میں یہ جو نمودار چار پانچ
> سو خوب جانتے ہیں کہ ہر اک رنگ کے
> انشا کی ہر غزل میں ہیں اشعار چار پانچ
>
> ہر قسم کا مال دوکانِ شاعری میں سجانے کے لیے وہ ایسے شاعروں کے رنگ میں بھی شعر کہتے ہیں جو مزاجاً متضاد ہیں مثلاً میر اور خواجہ درد، ادابندی، جس کے نمائندہ شاعر جرأت ہیں، انھیں اس لیے مرغوب ہے کہ وہ ان کے دور کا مخصوص و مقبول رنگ سخن ہے کبھی وہ مصحفی کے طرز میں غزل کہتے ہیں۔ استادی اور قادرالکلامی دکھانے کے لیے ساری غزل میں ایسے قافیے لاتے ہیں جن میں "زیر" آئے یا پھر سب پر زبر آئے۔ کبھی یہ کہہ کر: کبھی یہ کہہ کر: یعنی اور ایسی غزل لکھ کہ بس اک مطلع چھٹ جس میں ہر پھر کے یہی آوے تبرلیتا ہے۔ پھر اس غزل میں بارہ شعر ایسے لکھے کہ "تبرلیتا ہے" اس میں آیا ہے۔ کبھی بحر جدید (فعلاتن فعلاتن مفاعلن اور کبھی ریختی کے لہجے میں غزل کہتے ہیں۔ کبھی ایسی غزل کہتے ہیں جس میں "کی قسم" ردیف ہے اور طرح طرح سے قسمیں کھاتے ہیں۔ ایک غزل ایسی کہی جس میں صرف "چمک" کے مضمون باندھے:
>
> ع مضمون چمک کے چاند سے بھی کچھ دوچند باندھ
>
> پھر اسی زمین میں ایک اور غزل کہی جس میں "معانی عاشق پسند" باندھے اور پھر اسی زمین ایک اور غزل کہی جس میں ایسے شعر کہے جن میں "محبوب کا بگاڑ" باندھا گیا ہے۔ کہیں وہ کہانی کے سمے کی غزل کہتے ہیں کبھی ایسے شعر لکھتے ہیں جن میں حروف کو الٹنے سے صحیح لفظ بن جاتا ہے۔ محبوب نے لفافے پر لکھا ہے کہ "خط آشنا" کو پہنچے۔ یہ دراصل محبوب نے انشا کا نام الٹا لکھا ہے۔ سحر، کے وقت ماش کا دانہ پھینکا تو: ع: اشارہ میں نے تاڑا کہ ہے لفظ "شام" الٹا۔ گویا شام کے وقت ملاقات ہو گی۔ انشا نے "پانچوں" کی ردیف میں غزل کہی تو مخالفین نے ساتوں کی ردیف میں غزل کہی، انشاء نے اس کے جواب میں آٹھوں کی ردیف میں غزل کہہ کر مخالفین کو پچھاڑ دیا۔ یہ سب کام وہ اپنی شخصیت کے اظہار اور اپنی ذات کو اس معاشرے میں برتر و اعلیٰ بنانے کے لیے کریں۔ جیسا کہ میں نے کہا یہی ان کا مقصدِ شاعری اور یہی ان کا تخلیقی عمل ہے۔ انشا کے لیے شاعری ایک تماشا ہے جس میں وہ زبان فصاحت و بلاغت، جوشِ بیان، سلاست و روانی کا پوری طرح خیال رکھتے ہیں۔ وہ تماشا کرتے ہیں تماشا دکھاتے ہیں لیکن پوری سنجیدگی کے ساتھ یہی ان کا فن ہے۔"(18)

راقمہ نے بار بار اس طرف توجہ دلانے کی کوشش کی ہے کہ ہمارے محققین اور ناقدین نے انشا کا خود مطالعہ نہیں کیا جیسا کہ ایک شاعر کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ جیسے میر، درد، غالب، کی طرح انھوں نے صرف چند لوگوں کے مضامین پڑھ کر یا انشا کو سرسری سا پڑھ کر ان کی شخصیت پہ ان کے فن پہ ان کی تخلیقات پہ بہت کچھ کہہ گئے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ ان سب باتوں کا ثبوت ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کے ان جملوں سے ملتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ انشا نے "پانچوں" کی ردیف میں غزل کہی تو مخالفین نے ساتوں کی ردیف میں غزل کہی، انشا نے اس کے جواب میں آٹھوں کی ردیف میں غزل کہہ کر مخالفین کو پچھاڑ دیا۔

انشا نے صرف "آٹھوں" کی ردیف میں غزل کہہ کر مخالفین کو پچھاڑا نہیں بلکہ بیسوں اور تیسوں کی ردیف میں بھی غزل کہی۔ حیرت ہے کہ جمیل جالبی صاحب ان سے کیسے بے خبر رہے حال آں کہ یہ تو انشا کی بہت ہی مقبول اور بڑے ہی اہم غزل ہے۔ انھیں پڑھ کر انشا کی علمی قابلیت پہ عش عش کرنے کو جی چاہتا ہے۔ دراصل جمیل جالبی صاحب بھی قدرت اللہ قاسم اور آزاد اور شیفتہ کو پڑھنے کے بعد اپنے خیالات اظہار کیا ہے اگر جمیل جالبی صاحب انشا کو خود پڑھتے تو یقیناً وہ ان دونوں غزلوں سے آگاہ ہوتے۔ قصّہ مختصر وہ دونوں غزلیں ثبوت کے طور پر پیش کی جا رہی ہیں۔ آپ خود ہی انھیں پڑھ کر انشاء کی قادرالکلامی کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ کس قدر عالم شخص تھا جو لکھنا چاہتا ہے جیسے لکھنا چاہتا ہے۔ الفاظ اس کے سامنے ہاتھ باندھ کے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ راقمہ نے صرف غزل پیش کرنے کے بجائے ڈاکٹر تقی عابدی کی کتاب "انشاء اللہ خان انشا حیات، شخصیت اور فن" سے اس غزل کو نقل کرنا زیادہ مناسب سمجھا تاکہ اردو کے طالب علموں کے لیے سمجھنے میں زیادہ سہولت ہو گی۔ غزل پیش خدمت ہے۔

ڈاکٹر تقی عابدی لکھتے ہیں کہ اب چوتھی غزل ''بیسوں ایک'' کی ردیف میں دیکھیے:

گر ہوں افلاک وعقول اور نظر بیسوں ایک
مدرکات اور مقولات عشر بیسوں ایک

اس شعر میں نوافلاک یعنی فلک قمر، ملک عطارد، فلک زہرہ، فلک شمس، فلک مریخ، فلک مشرق، فلک زحل، فلک ثوابت اور فلک الافلاک شامل ہیں۔ عقول وہ دس فرشتے ہیں جنہیں خدا نے ایک کے بعد دیگرے پیدا کیا۔ مدرکات بھی دس ہیں یعنی یہ وہ قوتیں ہیں جن کی مدد سے انسان اشیا کی حقیقت دریافت کر سکے جسے ذہن، عقل، ذکا، فہم، ادراک، قوت دماغ، زیرکی وغیرہ۔ مقولات بھی دس ہیں جن میں کم، کیف، وضع، این، اضافہ، مستی، فلک، فعل، جوہر وغیرہ۔

استقامت ومو الید وجواہر خمسہ
ہفت اقلیم جہاں معدن ذر بیسوں ایک

اسطقات کو اربعہ عناصر کہتے ہیں جو ہوا، پانی، آگ اور مٹی ہیں۔ موالید تین ہیں۔ جمادات، نبادات اور حیوانات، ہفت اقلیم سے مراد دنیا کی قدیم تقسیم ہے جس میں دنیا کو سات حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

چودھوں علم وسب اعلان وذکا ودانش
فی المثل ہوویں ہم یہ بھی اگر بیسوں ایک

علم کو چودہ خانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اعلان بیماریوں کی چار چیزیں ہیں جن میں خون، بلغم، صفرہ وغیرہ شامل ہیں۔

تو بھی حیدرؑ کی ثنا کر نہ سکیں کچھ گو ہوں
بارہوں برج یہ آٹھ بہتر بیسوں ایک

بارہ برج سے مراد وہ دائرے ہیں جسے سورج ایک سال میں طے کرتا ہے جو حمل، ثور، حوزا، سرطان، اسد، سنبلہ، میزان، عقرب، قوس، جدی، دیو اور حوت۔

حامل وحی وحضرت چار کتب، بارہوں راس
مدح میں اس کی ہیں یہ شمس وقمر بیسوں ایک

بارہ راس وہ فرضی بارہ فلکی دائرے ہیں جن پر سیارے گھوم رہے ہیں۔ چار کُتب سے مراد چار صحیفہ آسمانی یعنی توریت، زبور، انجیل اور قرآن مجید ہیں۔

وہ شفیع آپ خود اور گیارہ امام آٹھ بہشت
جس پہ اشفاق کریں ہوں یہ ادھر بیسوں ایک
سات دن اور شب جمعہ مہینے بارہ
رکھتی ہیں اس کی اطاعت کا ہنر بیسوں ایک
پنجتن چودھوں معصومؑ حق انشاءاللہ
رکھیں الطاف کی سب تجھ پہ نظر بیسوں ایک

پانچویں غزل جس کی ردیف ''تیسوں'' ہے اس کے چند اشعار یہ ہیں:

تمہارے ہاتھوں کی یہ دیکھو پوریں غلام تیسوں
غرض کہ غش ہے اگر نامانو تو جھٹ اٹھالوں کلام تیسوں
امام بارہ، بروج بارہ، عناصر و جسم وروح، اے دل
یہی تو سرکار حق تعالیٰ کے ہیں مدار المہام تیسوں
نہیں عجائب کچھ آنکھ ہی میں رطوبتیں تین سات پردے

عقول دس، مدرکات دس، سو کرتے رہتے ہیں کام تیسوں

ایک اور غزل جس کی ردیف بھی ”تیسوں ہے۔ اس کے چند اشعار یہ ہیں:

دس عقل دس مقولے دس مدرکات تیسوں
تیرے ہی ذکر میں ہے اے پاک ذات تیسوں
نو آسماں خورمہ ساتوں طبق زمیں کے
روح و حواس خمسہ اور شش جہات تیسوں
سی پارہائے دل کو رکھیو محافظت سے
اے میری جاں ہیں تیری حفظ حیات تیسوں
ماہ گزشتہ کا حال انشاء کہوں سو کیوں کر
مر مر بسر کیے ہیں دن اور رات تیسوں (19)

جس طرح انشا پر الزامات لگائے گئے ہیں کہ انھوں نے نت نئی تخلیقات خواہ وہ شاعری میں خواہ نثر میں ہوں یہ انھوں نے اپنے ہم عصروں کو نیچا دکھانے کے لیے لکھے ہیں ان پر یہ بھی الزامات لگائے گئے ہیں کہ وہ رستمِ زمان بننا چاہتے تھے اور سب کو چِت کر دینا چاہتے تھے اور سب پر سبقت لے جانا چاہتے تھے اور اپنے حریفوں کا مُنہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کرنا چاہتے تھے تاکہ ان کی برتری بڑائی اور رستمی ہمیشہ قائم رہے اور دربار میں اس کا رعب و دبدبہ ہمیشہ برقرار رہے۔ یہ الزامات کوئی عام مضمون نگاروں یا عام شخصیات کے لگائے گئے الزامات نہیں ہیں۔ یہ الزامات ان تمام شخصیات نے لگائے ہیں جنھوں نے انشا پر مضامین لکھے ہیں۔ اردو ادب کی تمام تاریخوں میں اور انشا پہ لکھے گئے تمام مضامین ان الزامات سے بھرے پڑے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا ایک تخلیق کار شعوری طور پر کچھ تخلیق کر سکتا ہے کیا وہ اپنے حریفوں کو نیچا دکھانے کے لے شعوری طور پر اپنی لڑائی کو برقرار رکھنے کے لیے کچھ تخلیق کر سکتا ہے کہ نہیں؟

انشا روشنی کے اس لمحے کو گرفتار کرتے تھے جو انھیں ایک نئی منزل کا راستہ دکھاتا تھا اور ان کا تخیل اُسے ظاہری شکل دینے میں کامیاب ہوتا تھا اور انشا اس کے فنی اظہار کے ذریعے پر قادر تھے یعنی زبان پر انشا کو مکمل عبور حاصل تھا جس کی بدولت وہ ایک نئی تخلیق کو جنم دیتے تھے۔ اس کا دیوان بقول انشا ایک تماشا ہے۔

اشعار ملاحظہ فرمائیں:

دیوان سینکڑوں ہیں ہم نے تو دیکھے لیکن
ان میں نظر پڑا کب پایا جو یاں تماشا
کیا خوب، واہ، ماشاءاللہ، ہے عجب کچھ
دیوان میر انشاءاللہ خاں تماشا(20)

راقمہ انشا کے دیوان کو تماشا نہیں تصور کرتی بل کہ انشا کے دیوان میں علم کا خزانہ چھپا ہوا ہے۔ ان کے دیوان کے مطالعے سے عقل دنگ رہ جاتی ہے کہ اس شخص نے اتنا علم کیسے حاصل کیا؟ ان کو آسمان اور زمین کے بیموجودات کا علم ہے خواہ وہ پھول بوٹے ہوں حکایات ہوں، ستارے سیارے ہوں، قیمتی پتھر ہوں جنگی ساز و سامان ہوں، قرآن پاک کا علم ہو، تلمیحات، محاورات، جواہرات، دریا، زیورات، شجر اور جڑی بوٹیاں، شخصیات و القاب (بشمول ملائک، شیاطین، جنات، اصنام وغیرہ) کتب، مقامات، غذا (کھانے، مٹھائیاں اور ان کی قسمیں) شجر اور جڑی بوٹیاں، سواریاں، پھول، پھل، پیشے، پیشہ واراں، عہدے، عہدیداران اور نوکر چاکر، پوشاکیں کپڑے اور ان کی قسمیں پرندے، پتنگے، جانور اور کیڑے مکوڑے، باجے (مضامیر) اور راگ راگنیاں، اوزار، ہتھیار اور جنگی ساز و سامان، اور ان کی وہ ردیف وار غزلیں جو پانچوں، ساتوں، آٹھوں، بیسوں اور تیسوں دیوان بے نقط، مثنویات، رباعیات وغیرہ وغیرہ انسان گنتا رہے مگر انشا کی تخلیقات ختم نہ ہوں۔ آفریں ہے اس شخص پر جو ہر وقت دنیا کے ہجوم میں اور درباروں کی کٹھن ملازمت کے باوجود اتنا کچھ لکھ گئے کہ ہم لکھتے رہیں اور ان کی تخلیقات ختم ہونے کا نام نہیں لے رہے ہیں اور دو جملے اس شخص کی تعریف میں لکھتے ہوئے ہمارے قلم ٹوٹ جاتے ہیں۔ ہمارے نقادوں اور اردو ادب کے نامور شخصیات نے ان پر الزامات لگائے ہیں کہ انھوں نے یہ سب تخلیقات دوسروں کو نیچا دکھانے کے لیے لکھا ہے۔ حال آں کہ اب ہم یہ جان چکے ہیں

کہ تخلیقی عمل فنکار کی قوتِ ارادہ کا پابند نہیں ہے۔ تخلیق کرتے ہوئے شعوری کاوش کو زیادہ دخل نہیں ہوتا، ایک بے خودی کی سی کیفیت اس واردات کے دوران فرد کے وجود کو اپنے قابو میں لے لیتی ہے۔ فرد کا شعوری احساس اس عمل کے بے حجابانہ ظہور میں آنے میں رکاوٹ بنتا ہے۔ یہ واردات اسی وقت ہی زیادہ بھرپور ہوتی ہے جب فرد کا اپنا سماجی، منطقی و تنقیدی خاصہ معطل ہوتا ہے۔

انشا کو اپنی شاعری اور قابیت کا بہت ہی اچھی طرح سے علم تھا انھیں عطیۂ خداوندی کا علم تھا انہیں اپنی ذات کی مخصوص وہبی اور قدرتی ودیعت کا شعور اور اپنی منفرد اہمیت کا بھرپور علم تھا۔ اس لیے وہ لکھتے ہیں:

کیا چیز بھلا قصر فریدوں مرے آگے
کانپے ہے پڑا گنبد گردوں مرے آگے
مرغان اولی اجنحہ مانند کبوتر
کرتے ہیں سدا عجز سے غوں غوں مرے آگے
ہوں وہ جبروتی کہ گروہ حکماسب
چڑیوں کی طرح کرتے ہیں چوں چوں مرے آگے
بولے ہے یہی خامہ کہ کس کس کو میں باندھوں
بادل سے چلے آتے ہیں مضموں مرے آگے
ہے مرحلہ خم غدپر آنکھوں میں چھپایا
کیوں چھپ نہ رہے خم میں فلاطوں مرے آگے (21)

غزل کے یہ اشعار فنی اعتبار سے لاجواب اور تعلی میں عالی ہیں۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ انشا کی منفرد شخصیت اور منفرد تخلیقات کو ہمارے نقادوں اور قلم کاروں نے قبول نہیں کیا بل کہ الٹا انہیں تنقید کا نشانہ بنایا شیفتہ کا کہنا ہے کہ انشا نے قدما کی پیروی نہیں کی۔ حمد یہ مضامین میں بھی انشا بعض اوقات اپنی شوخی نہیں چھوڑتے اور مضامین میں عجب معرفت کے گل کھلاتے ہیں:

کیا خدا سے عشق کی میں رونمائی مانگتا
مانگتا بھی اُس سے تو ساری خدائی مانگتا
اسے خلوت کی ٹھہر جاتی تو میں اللہ سے
واسطے دو دن کے عرش کبریائی مانگتا (22)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے انشا اور میر کا موازنہ کیا ہے، ملاحظہ فرمائیں:

> ”غزل کی علامتوں اور کنایوں نے انشا کی شخصیت کو چھپایا ضرور ہے لیکن اس پردے کے باوجود ان کی شخصیت کھل کر غزل میں سامنے آتی ہے انشا غزل میں اپنی شخصیت کی نفی نہیں کرتے بلکہ اسے ظاہر کرتے ہیں۔ انشا کے تخلیقی عمل کو سمجھنے کے لیے ایک بالکل متضاد مثال میر کی لیجیے۔ میر اپنی ذات کو مسلسل کسی ایسی چیز کے سپرد کرتے رہتے ہیں اور اپنی ذات کو مسلسل قربان کرتے رہتے ہیں۔ تخلیقی سطح پر ان کے ہاں وہ آدمی جو دکھ اٹھا رہا ہے اور وہ دماغ جو تخلیق کر رہا ہے الگ الگ ہو جاتے ہیں اور وہ خود کو دور رکھ کر دیکھنے کی صلاحیت پیدا کر لیتے ہیں اس لیے میر کو معلوم ہے کہ وہ کون سے تجربات ہیں جو ان کے لیے تو اہم ہیں لیکن شاعری کے لیے اہم نہیں ہیں۔ اس تخلیقی عمل نے میر کو ایک عظیم اور آفاقی شاعر بنا دیا ہے۔ انشا کا تخلیقی عمل اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ تجربات و تاثرات جو ان کے لیے اہم ہیں وہی ان کی شاعری کے لیے بھی اہم ہیں۔ وہ تخلیقی عمل میں اپنی ذات کو قربان نہیں کرتے اور نہ اپنی شخصیت کو معدوم کرتے ہیں بلکہ صرف اسے ہی اہمیت

دیتے ہیں اور اسی کا اظہار کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اپنے دور میں وہ بڑے اور ممتاز شاعر شمار ہوئے لیکن آج معلوم ہوتا ہے کہ انشا کی شخصیت ان کی شاعری سے بڑی ہے اور ان کی شاعری ان کی شخصیت سے چھوٹی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے دور پر تو چھا جاتے ہیں لیکن اس کے بعد وہ سمٹ کر سکڑ جاتے ہیں۔ وہ دس غزلہ یا اٹھارہ غزلہ اس لیے نہیں کہتے کہ ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ ہے بلکہ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ اپنی شخصیت کی عظمت اور اپنی قادر الکلامی کا اظہار کر کے اپنی رستمی کا سکہ سب کے دلوں پر جما سکیں اور خود شعر و سخن کے جگت سیٹھ کہلا سکیں:

یہ سچ سمجھو کہ انشا ہے جگت سیٹھ اس زمانے کا
نہیں شعر و سخن میں کوئی اس کی ساکھ کا جوڑا

اپنے زمانے کا جگت سیٹھ بننے کے لیے انشا نے اپنی دوکانِ شاعری میں ہر قسم کا مال جمع کیا جس کی مانگ تھی تا کہ ہر قسم کا گاہک ان کی دوکان پر آئے اور اپنی پسند کی چیز حاصل کر سکے۔ انشا شعوری طور پر یہ کام کرتے ہیں اور اپنی دوکان چمکانے کے لیے اپنی غزل میں اشتہار بھی دیتے ہیں:

میر و قتیل، مصحفی و جرأت و مکیں
ہیں شاعروں میں یہ جو نمودار چار پانچ
سو خوب جانتے ہیں کہ ہر ایک رنگ کے
انشا کی ہر غزل میں ہیں اشعار چار پانچ (23)

جمیل جالبی صاحب انشا کے شاعرانہ اوصاف کے حوالے سے لکھتے ہیں:

> ”معاملہ بندی بنیادی طور پر انشا کی انفرادیت نہیں ہے۔ اس رنگ نے انشا کی مجلسی شاعری کو مقبول تو بنایا لیکن معاملہ بندی کی شاعری میں وہ جرأت ہی کو داد دیتے رہے۔ انشا سراپا نگاری کرتے ہیں کہ یہ اس دور کا نہایت مرغوب و پسندیدہ رنگ تھا لیکن یہاں بھی وہ جرأت سے آگے نہیں بڑھتے۔ سراپا نگاری جرأت کا خاص فن تھا۔ جنس اور وصل کے معاملات کے بیان میں بھی انشا کے ہاں وہ تراوٹ نہیں ہے جو ہمیں جرأت کی مزے دار شاعری میں ملتی ہے۔ انشا کا یہ رنگ سخن بھی ان کے درباری مزاج اور مجلسیت کا حصہ ہے۔ یہاں بھی ان کی شاعری میں تماشا دکھانے اور ڈگڈگی بجانے کا پہلو نمایاں ہے۔ اہلِ دربار اور صاحب دربار کو خوش کرنا اور داد لینا یہی انشا کی شاعری کا مقصد ہے۔ ان کی ساری زندگی اسی دائرے میں گھومتی ہے۔ زندگی کو اس زاویہ نظر سے دیکھنے سے انشا نے ہر اس رنگ میں شعر کہے جسے اہلِ محفل پسند کرتے تھے خواہ وہ رنگ ان کا ہو یا نہ ہو اس لیے ان کی غزل میں ہمیں مختلف رنگ کے اشعار ملتے ہیں۔ وہ اپنی غزل کو ایک ایسا گل دستہ بنا کر پیش کرتے ہیں جس میں مختلف رنگ ہوں تا کہ مختلف رنگوں کو پسند کرنے والے اہلِ محفل انھیں پسند کریں اور دل کھول کر داد دیں اور اس طرح ان کی حیثیت کا قد بڑھتا رہے۔ ان کی غزلوں میں اسی لیے بیک وقت استادانہ ہنر مندی بھی ہے اور مشکل زمینوں میں نئے نئے قافیے لانے کی کاوش بھی تمسخر اور ظرافت بھی ہے اور دھواں دھار انداز بھی۔ کبھی وہ چھیڑ چھاڑ کی غزل کہتے ہیں اور لاکھ شوخیوں کو نوکِ قلم سے بیاں کرتے ہیں۔“(24)

جمیل جالبی صاحب نے انشا پر جو الزامات لگائے ہیں کہ انھوں نے دوسروں کے رنگ میں اس لیے شاعری کی کیوں کہ انشا کا یہ رنگ سخن بھی ان کے درباری مزاج اور مجلسیت کا حصہ ہے۔ یہاں بھی ان کی شاعری میں تماشا دکھانے اور ڈگڈگی بجانے کا پہلو نمایاں ہے۔ اہلِ دربار کو خوش کرنا اور ان سے داد لینا یہی انشا کی شاعری کا مقصد ہے۔ جمیل جالبی صاحب نے بھی آزاد، شیفتہ، قدرت اللہ قاسم کی طرح انشا کا نام ڈبونے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔ گھٹن والے معاشرے میں ایک شاعر ہی تو ہے جو آزاد ہے جو کسی بھی موضوع میں شاعری کر سکتا ہے کوئی اس کو روک نہیں سکتا۔ وہ نڈر ہوتا ہے۔ ان مہذب نقاب پوشوں سے شاعر بے زار ہوتا ہے جو بظاہر اپنے آپ کو بڑے مہذب اور پرہیز

گارڈ کھاتے ہیں مگر چھپ کر وہ تمام کام کرتے ہیں دوسری طرح ایک شاعر اپنے اشعار میں وہ سب کچھ لکھتا ہے جو شاید اس نے کبھی کیے بھی نہ ہوں۔ ایک عام انسان شعر و شاعری کرتے ہوئے ڈرتا ہے معاملہ بندی کے اشعار، عشق و عاشقی کے اشعار اور ریختی جیسے اشعار لکھتے ہوئے سو بار سوچے گا کہ میرے والدین، بہن بھائی، عزیز و اقارب محلے والے یا معاشرہ یہ سب کیا سوچیں گے کیا کہیں گے لیکن جو ایک حقیقی شاعر ہو گا وہ ان تمام باتوں سے بے نیاز ہوتا ہے اسے پروا نہیں ہوتی کہ معاشرہ والدین اور عزیز و اقارب کیا سوچیں گے کیا کہیں گے۔ انھیں صرف اور صرف تخلیق سے غرض ہوتا ہے کیونکہ ادب انسان کو تنگ نظر نہیں بناتا۔ نہ ادب کا کام تبلیغ کرنا اور اخلاقیات سکھانا ہے۔

ایک سچے ادیب کے سامنے صرف تخیل، جذبہ اور اسلوب اہم ہوتا ہے باقی موضوع کوئی بھی باندھ سکتا ہے تو اس لئے جمیل جالبی صاحب کا یہ لکھنا کہ انشا نے ہر اس رنگ میں شعر اس لیے لکھا کہ اہم محفل انھیں پسند کریں داد دیں ان کی حیثیت کا قد بڑھتا رہے۔ جمیل جالبی صاحب کو انشا کو داد دینی چاہیے تھی لیکن جالبی صاحب کو انشا کا انداز پسند نہیں آیا۔ راقمہ کی نظر میں دوسروں کے رنگ میں اشعار کہنا بنسبت اپنے رنگ کی زیادہ مشکل ہے لیکن یہ انشا کا ہی کمال ہے کہ وہ ہر رنگ میں شعر و شاعری کرتے رہے کسی اصناف کو نہیں چھوڑا۔ راقمہ کی نظر میں یہ ان کی قابلیت اور قادر الکلامی کا ثبوت ہے ہمیں انشا کو سراہنا چاہیے نہ کہ تنقید کا نشانہ بنانا چاہیے۔ کیوں کہ شاعر اپنے موضوع کے حوالے سے آزاد ہے وہ کسی بھی موضوع میں شعر و شاعری کر سکتا ہے۔

انشا کے بارے میں جمیل جالبی صاحب نے جو کچھ لکھا ہے اسے پڑھ کر سطحی سوچ رکھنے والے تو ضرور جمیل جالبی صاحب کو داد دیں گے کہ انھوں نے انشا پر طنز کے زبردست تیر چلائے ہیں لیکن عقل و شعور رکھنے والے اور اردو ادب کے سنجیدہ طالب علم غور و فکر ضرور کریں گے کہ جمیل جالبی صاحب کو انشا جیسے باکمال اور صاحب علم شخصیت پر ایسے تنقید نہیں کرنا چاہیے۔ اس کے علاوہ جمیل جالبی صاحب کا انشا کو ایک شاعر کو دکان دار کہنا اور دکان دار قرار دینا اور ان کے اشعار کو اشتہار کہنا۔ تمام صاحبانِ علم کے لیے ایک سوالیہ نشان ہے۔

حوالہ و حواشی

1۔ ابو اللیث صدیقی، ڈاکٹر، لکھنؤ کا دبستان شاعری ، لاہور، بک ٹاک، 2017ء، ص202
2۔ انشا، انشاءاللہ خاں، " رانی کیتکی اور سلکِ گوہر "، مرتبہ: انتظار حسین، لاہور، مجلس ترقی ادب، اشاعت: دوم، ستمبر 2008 ص18،17،16
3۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، جلد سوم، لاہور، مجلسِ ترقی ادب، طباعت: سوم جولائی 2013ء، ص513
4۔ انشا، انشاءاللہ خاں، رانی کیتکی اور سلکِ گوہر ، مرتبہ: انتظار حسین، لاہور، مجلس ترقی ادب، اشاعت: دوم، ستمبر 2008ء، ص15
5۔ انشا، انشاءاللہ خاں، کلیات انشاء، مرتبہ: خلیل الرحمٰن داؤدی، جلد: اوّل، لاہور، مجلس ترقی ادب، س۔ن، ص364
6۔ ایضاً، ص74
7۔ ایضاً، ص163
8۔ ایضاً، ص54
9۔ ایضاً، ص140
10۔ ایضاً، ص140
11۔ ایضاً، ص75
12۔ ایضاً، ص73
13۔ ایضاً، ص61
14۔ ایضاً، ص453
15۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، جلد سوم، لاہور، مجلسِ ترقی ادب، طباعت: سوم جولائی 2013ء، ص456
16۔ رام بابو سکسینہ، تاریخ ادب اردو، مترجم: محمد عسکری، لکھنؤ، مطبع منشی نولکشور، س۔ن، ص106
17۔ محمد خان اشرف، ڈاکٹر، کتاب ادب کیا ہے؟، لاہور، مرکز زبان و ثقافت، س۔ن، ص24

18۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، جلد سوم، لاہور، مجلسِ ترقی ادب، طباعت: سوم جولائی 2013ء، ص107

19۔ انشا، انشاءاللہ خاں، کلیات انشاء، مرتبہ: خلیل الرحمٰن داؤدی، جلد: اوّل، لاہور، مجلس ترقی ادب، س۔ن، ص412

20۔ انشا، انشاءاللہ خاں، کلیات انشاء، مرتبہ: خلیل الرحمٰن داؤدی، جلد: اوّل، لاہور، مجلس ترقی ادب، س۔ن، 78

21۔ ایضاً، ص49

22۔ ایضاً، ص454،453

23۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، جلد سوم، لاہور، مجلسِ ترقی ادب، طباعت: سوم جولائی 2013ء، ص132

24۔ جمیل جالبی، ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، جلد سوم، لاہور، مجلسِ ترقی ادب، طباعت: سوم جولائی 2013ء، ص131